امریکی مڈ ٹرم انتخابات

تحریر: استاد محمد ابراہیم – امریکہ

(ترجمہ)

عام طور پر امریکی مڈ ٹرم انتخابات ہر 4 سال بعد نومبر کے پہلے پیر کے بعد آنے والے منگل کو امریکی صدر کی 4 سالہ مدتِ صدارت کے وسط میں منعقد ہوتے ہیں۔

ان انتخابات میں ایوانِ نمائندگان (House of Representatives) کے تمام 435 اراکین کا انتخاب شامل ہوتا ہے، کیونکہ ایک نمائندے کی مدتِ رکنیت 2 سال ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سینیٹ (Senate) کے کل 100 اراکین میں سے تقریباً ایک تہائی اراکین (33 سے 35) کا انتخاب ہوتا ہے، کیونکہ ایک سینیٹر (Senator) کی مدتِ رکنیت 6 سال ہوتی ہے۔ اسی طرح ان انتخابات میں کل 50 ریاستی گورنروں میں سے 34 سے 39 گورنروں کا انتخاب بھی شامل ہوتا ہے، نیز ریاستوں کی سطح پر قانون ساز اسمبلیوں اور بلدیاتی سطح پر مقامی اداروں کے انتخابات بھی ہوتے ہیں۔ یہ حالیہ انتخابات منگل، 3 نومبر 2026ء کو منعقد ہوئے ہیں۔

اور یہ ایک قدرتی بات ہے کہ مڈ ٹرم انتخابات کے دوران حکمران جماعت ایوانِ نمائندگان اور سینیٹ میں اکثریت کھو دیتی ہے، بلکہ یہ نتیجہ امریکی سیاست میں ایک عام قاعدہ اور ثابت شدہ قانون سمجھا جاتا ہے۔

امریکی خانہ جنگی (Civil War) کے بعد سے اب تک صدر کی جماعت 40 میں سے 37 بار مڈ ٹرم انتخابات ہار چکی ہے۔ اس شکست کی متعدد وجوہات ہیں، جن میں سب سے اہم وجہ صدر کی حکومت کے پہلے دو سالوں کے دوران پیدا ہونے والے اقتصادی یا سیاسی بحرانوں پر اس کی جماعت کو سزا دینا ہے۔ اس ہفتے منعقد ہونے والے مڈ ٹرم انتخابات بھی اس عام قاعدے سے مختلف نہیں تھے۔ ڈیموکریٹک پارٹی (Democratic Party) نے ایوانِ نمائندگان، سینیٹ اور ریاستی گورنروں کے انتخابات میں اکثریت حاصل کر لی ہے۔ سب سے نمایاں کامیابی ریاست کینساس (Kansas) میں دیکھنے کو ملی، جہاں ڈیموکریٹک پارٹی نے سینیٹ کی ایک ایسی نشست حاصل کر لی جس پر 1932ء کے بعد سے کوئی بھی ڈیموکریٹ کامیاب نہیں ہوا تھا۔ جبکہ ریاست ٹیکساس (Texas) میں، جسے ریپبلکن پارٹی (Republican Party) کے تاج کا نگینہ سمجھا جاتا ہے اور جو رقبے و آبادی کے لحاظ سے بڑی اور امیر ریاستوں میں شمار ہوتی ہے، ریپبلکنز گورنر کے عہدے اور سینیٹ کی نشست دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ریپبلکنز کی اس شکست پر شاید سب سے بلیغ بات وہی ہے جو ریاست ٹیکساس سے سینیٹ کے دو اراکین میں سے ایک، ٹیڈ کروز (Ted Cruz) نے کہی: "ٹیکساس کا نیلا ہونا بولنے میں ایک مشکل جملہ ہے، لیکن آج ٹیکساس کم از کم نیلا ہو چکا ہے"، جبکہ نیلا رنگ ڈیموکریٹک پارٹی کی اور سرخ رنگ ریپبلکن پارٹی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے افسوس کے ساتھ اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ وہ ریاست کی سطح پر منتخب عہدے پر برقرار رہنے والے واحد باقی ماندہ ریپبلکن عہدیدار بن گئے ہیں۔

لیکن اس سال کے انتخابات نے اندرونی اور عالمی سطح پر ایک ایسا شور و غوغا پیدا کیا ہے جو ماضی کے انتخابات سے مختلف ہے۔

بہت سے لوگ امریکہ کی اندرونی اور بیرونی پالیسیوں میں تبدیلیوں کی امید لگا رہے ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک عام لوگوں اور یہاں تک کہ پوری دنیا کے سیاست دانوں کے چہروں پر ایک عمومی خوشی دکھائی دے رہی ہے۔ اور یہ خوشی ٹرمپ اور امریکہ کی اس خارجہ پالیسی کے خلاف بغض و عناد کا نتیجہ ہے جو ظلم، جبر، جنگوں اور لوگوں کی ضروریات کے استحصال پر مبنی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان انتخابات میں ڈیموکریٹس کی اکثریت کے نتائج ٹرمپ کے باقی ماندہ دو سالوں میں ان کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کریں گے؟

اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہم چین، یورپ اور اسلامی ممالک کے بارے میں ٹرمپ کی خارجہ پالیسی نیز ان کی اندرونی پالیسی پر نگاہ ڈالیں گے۔

جہاں تک ٹرمپ کی خارجہ پالیسی کا تعلق ہے، تو اس میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کی توقع نہیں ہے، اور نہ ہی ڈیموکریٹک پارٹی سے کسی قابلِ ذکر تبدیلی کا مطالبہ کرنے کی امید ہے—سوائے شاید اسالیب میں کچھ تبدیلی کے— کیونکہ امریکہ کی خارجہ پالیسی اس کے اپنے مفادات اور بڑی کمپنیوں (Corporations) کے مفادات پر قائم ہے۔

چنانچہ چین کے بارے میں اس کی پالیسی تبدیل نہیں ہوگی، کیونکہ یہ پالیسی اچانک پیدا نہیں ہوئی بلکہ اس پر پورے امریکہ کا اتفاقِ رائے موجود ہے۔ اور یورپ کے معاملے میں بھی دونوں جماعتوں کا اتفاقِ رائے ہے؛ بائیڈن (Biden) انتظامیہ نے، جو کہ ڈیموکریٹ تھے، یورپ کو یوکرین کی جنگ میں دھکیلا، اور جب ٹرمپ آئے تو انہوں نے بھی اسے نہیں روکا، حالانکہ وہ اپنی انتخابی مہم کے دوران پیوٹن (Putin) کے ساتھ اپنے تعلقات پر فخر کرتے تھے اور دعویٰ کرتے تھے کہ وہ ایک ہی دن میں اس جنگ کو روکنے پر قادر ہیں۔ جہاں تک اسلامی ممالک کا تعلق ہے، تو اس معاملے پر بھی دونوں جماعتوں میں کامل اتفاق ہے، اور دونوں جماعتوں میں لفظی فرق کے سوا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ چنانچہ دونوں انتظامیہ کے دور میں غزہ کی صورتِ حال میں کوئی فرق نہیں آیا؛ نسل کشی (Genocide) اب بھی جاری ہے اور بھوک سے مارنا نیز ناکہ بندی (Blockade) اب بھی قائم ہیں۔ عراقی صورتِ حال بھی امریکی انتظامیہ کی تبدیلیوں کے باوجود نہیں بدلی، اور یہی حال باقی اسلامی ممالک کا ہے۔ رہی بات ایران کے ساتھ جنگ میں پیش آنے والے واقعات کی، تو امریکہ نے آبنائے ہرمز (Strait of Hormuz) میں ہونے والی پیش رفت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے توانائی کی کمی اور اس کی قیمتوں میں اضافے کے باعث یورپ پر اقتصادی دباؤ بڑھایا ہے، جس کے نتیجے میں پیداواری لاگت بڑھ گئی اور متعدد کمپنیاں دیوالیہ ہو گئیں۔ اور ممکن ہے کہ ڈیموکریٹس ٹرمپ پر ایران کے ساتھ ایک ایسا معاہدہ کرنے کے لیے دباؤ ڈالیں جو امریکہ کے مفادات کی ضمانت دے، تاکہ اس کے ساتھ جنگ میں داخل ہونے سے بچا جا سکے؛ کیونکہ یہ جنگ ان مسائل میں سے ایک تھی جس نے ان کی کامیابی میں کردار ادا کیا، کیونکہ اس کی وجہ سے قیمتیں بے تحاشا بڑھ گئیں، نیز امریکی عوام بھی ایسی بیرونی جنگوں میں شامل ہونے کے خلاف ہیں جن میں ان کے بچوں کی جانیں چلی جائیں۔

البتہ اندرونی پالیسی کی سطح پر کچھ رکاوٹیں اور کچھ اختلافات دیکھنے کو ملیں گے۔

ہر جماعت اپنے اراکین یا حامیوں کو سرکاری عہدوں جیسے ججوں اور سفیروں کے مناصب پر تعینات کرنے اور جنہیں وہ پسند نہیں کرتے انہیں سرکاری اداروں سے ہٹانے کی کوشش کرتی ہے۔ نیز اندرونِ ملک توانائی کی قیمتوں کو کم کرنے اور ان کسٹم ٹیرف کی جنگ کو روکنے کے لیے دباؤ ڈالا جائے گا جو ٹرمپ نے دنیا کے ممالک پر عائد کیے تھے اور جن کے منفی اثرات امریکہ کے اندر قیمتوں پر پڑے تھے۔ اسی طرح رائج الوقت پالیسی برائے ہجرت (Immigration Policy) میں کچھ رکاوٹیں ہوں گی کیونکہ لوگ اس کی شکایت کرتے ہیں، اور ڈیموکریٹس ہم جنس پرستوں اور غیر فطری رجحانات کے حامل افراد سے متعلق اپنے ایجنڈے کو نافذ کرنے کی کوششوں کی طرف دوبارہ لوٹیں گے۔ جہاں تک امریکہ کے اندر مسلمانوں کا تعلق ہے، تو وہاں اسالیب کی تبدیلی اور نرم الفاظ کے استعمال کے سوا کوئی بڑا فرق نہیں ہوگا، اور مسلمانوں کو گلے لگانے اور انہیں کچھ عہدے دینے کے ذریعے امریکی اقدار میں ضم کرنے کی کوشش کی جائے گی، جیسا کہ حال ہی میں منتخب ہونے والے سینیٹر عبدالرحمن السید (Abdul El-Sayed) کے معاملے میں ہوا۔

اور آخر میں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ امریکی صدر کے پاس ویٹو (Veto) کا حق حاصل ہے، جس کی دھمکی انہوں نے دی تھی اور جسے انہوں نے انتخاب کے نتائج کے بعد سے اپنے صدارتی دفتر میں اپنی نئی ٹوپی پر لکھ رکھا ہے، اور وہ کانگریس (Congress) کی طرف رجوع کیے بغیر بھی صدارتی اجرائے احکام (Executive Orders) کے ذریعے فیصلے نافذ کر سکتے ہیں۔